سامنے گھٹنے ٹیک کر دامن پھیلایا اور مامتا کی ساری بھیک اس میں ڈلوانے پر زور لگانے لگا۔ ماں کا دل بچے کے لیے محبت سے لبریز ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کو سینے سے لپٹا لیا اور اس کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ جب دونوں ماں بیٹا آدھی رات تک اپنے آنسوؤں کا خزانہ ختم کر چکے تو ماں نے اپنے دوپٹے سے بیٹے کے چہرے پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کے نشان صاف کیے اور آہستگی سے کہا: "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیرا ساتھ دوں گی اور تیری شادی میں شامل ہوں گی۔" بیٹا ایک لفظ کہے بغیر سسکیاں بھرتا ہوا ماں کی گود میں سو گیا۔ اگلے دن اس کی ماں نے حسبِ وعدہ اپنی بھانجی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا جو الیف اے کے آخری سال میں تھی۔ ہمارا ساتھی اپنی دلہن کو ساتھ لے کر پہاڑ پر واپس آ گیا اور ہم نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے مکان تلاش کرنے لگے۔ سب سے اچھا اور سستے کرائے کا مکان جو ملا وہ اس خاتون نے ڈھونڈا تھا جو سبز رنگ کا کوٹ پہنتی تھی اور سر پر جوگیا رنگ کا دوپٹہ لیتی تھی۔

مرد کا کام عورت کو سمجھنا نہیں، اُس کو محسوس کرنا، اُس کی حفاظت کرنا اور اُس سے محبت کرنا ہے۔ عورت کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ مرد اُس کو سمجھنے لگا ہے یا اُس کے جذبات کو جانچنے کا راز پا گیا ہے تو وہ فوراً تڑپ کر جان دے دے گی۔ آپ عورت کے ساتھ کتنی بھی عقل و دانش کی بات کریں۔ کیسے بھی دلائل کیوں نہ دیں۔ اگر اس کی مرضی نہیں ہے وہ تو اس منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔ اس کے ذہن کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ رُوم ہوتا ہے جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا ہوتا ہے وہ اسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی اسی لیے وہ کسی عقل و دانش اور دلائل کے معاملے میں مانگے کی روشنی پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد اور آخری حل ہوتا ہے۔

ایک بڑے سے پتھر پر پاؤں رکھ کر تسمہ باندھتے ہوئے ہمارے اس دوست نے مڑ کر دیکھا اور کہا: "دوستو! اگلے مہینے ایک ایک ہفتہ اپنی مصروفیات سے نکال کر رکھنا تمہارے بھتیجے کی شادی ہے۔"

"شادی۔" میں نے حیرانی سے پوچھا: "اتنا بڑا ہو گیا؟"

وہ زور سے ہنسا اور پیچھے کو لپک گیا۔

"سُنتے ہو مفتی جی۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "شاہ جی ابھی تک اپنے آپ کو جوان سمجھ رہے ہیں۔"

میں کچھ کھسیانا سا ہو گیا اور بات ٹالنے کی غرض سے بولا: "کہاں ہو رہی ہے شادی؟"

"آپ کے لاہور میں۔ گلبرگ تھری کے کنارے ماڈل ٹاؤن کی طرف۔"

"کون لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس سالے کو کیا پتہ ہے کون لوگ ہیں۔" مسعود نے خوخیا کر کہا: "اس نے لڑکی تلاش کر کے دی ہے ہرے کوٹ والی نے۔"

"اس کے ساتھ اب بھی مراسم ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں شاہ جی۔" ہمارے دوست نے سکون کی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "وہ تو کب کا سینر فائر ہو چکا!"

پھر کافی دیر تک خاموشی رہی۔ اندر اور باہر چین ہی چین لکھا ملا۔ راستے کے اردگرد پھولوں کی بہتات ہو گئی تھی۔ یہ پھول سیپ کے بٹن کی طرح چھوٹے اور شکل و صورت سے لونگ کے قریب تھے۔ کوئی نیلا تھا، کوئی گلابی کوئی سفید کوئی اودا۔ ہمیں ایک پن چکی والے نے بتایا تھا کہ اوپر تم کو چھوٹے چھوٹے پھول ملیں گے انہیں توڑنا مت، وہ شہزادی بدیع الجمال کا ہار سنگھار ہیں۔ اگر ان میں سے دو پھول بھی کم ہو جائیں تو اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سنگھار کے معاملے میں عورت کو پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر اس کے پاس کوئی چیز کم ہو جائے تو وہ زندہ تو رہتی ہے لیکن چھپی چھپی ڈری ڈری ہوئی سی، جیسے اپاہج آدمی محبت اور خوش اخلاقی سے ملتا ہے لیکن اس کی خوش اخلاقی کے اندر خوف اور شرمندگی کا تو نبہ بج رہا ہوتا ہے اور وہ نہ مسکرانے والی بات پر بھی مسکراتا رہتا ہے۔ عمر نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گردن گھمائی اور پھر ایک زور کی ہانک لگا کر کہا: "اوئے یہ اعظمی کدھر مر گیا؟" ہم سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بڑے سے پتھر پر اعظمی مرا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں سفید سی ہو گئی تھیں۔ مسعود نے کہا: "اٹھو یار اس طرح بیٹھنے لگے تو یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو گا۔"

"میں نے راستہ ختم کر دیا۔" اعظمی نے منہ ہماری طرف کر کے جواب دیا: "اب میں خلوت کے ساتھ بیٹھا ہوں اور میرا اس کی کمپنی سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"تیری خلوت کی ایسی تیسی۔" عمر جھڑک کر بولا: "اس کو ساتھ لانا تھا تو ہمارے ساتھ کیوں آئے تھے؟"

"حد ہو گئی۔" اعظمی نے آنکھیں بند کر کے چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا لیا اور کہنے لگا۔ "کمال کے قافلہ سالار ہو۔ ہمارے ساتھ ہمارے حرم کو آنے سے روکتے ہو۔ اس کا کچھ بار تم لوگوں پر نہیں ہے۔ ہم اس کا خیمہ الگ لگاتے ہیں، اس کی پاسبانی خود کرتے ہیں، سارے مصارف خود برداشت کرتے ہیں۔ پھر تم ہم کو اس کی محبت سے جُدا کیوں کرتے ہو؟"

"یہ کس کی محبت کا ذکر ہو رہا ہے؟" مُفتی نے اپنے کوہستانی کو روک کر پُوچھا۔

"کچھ نہیں یار مُفتی جی، محبت کا ذکر ہو رہا ہے اور بھائی لوگ ناراض ہوتے ہیں۔" اعظمی کی آنکھیں ویسے ہی بند تھیں۔

"چلو چلو۔" لیڈر بولا۔ "چلو دفع کرو اس کو مرنے دو، ختم ہونے دو، ویرانی میں گمنامی میں مر جائے گا تو کوئی اس کو پُوچھنے بھی نہیں آئے گا۔ چلو میرے شیر و شاباش۔"

مُفتی نے کہا۔ "اور اگر تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ میرے مر جانے کے بعد کیا ہو گا تو سوچو کہ تم سے پہلے جو مر گئے ان کے چلے جانے کے بعد کیا ہُوا۔"

"واہ مُفتی واہ۔" مسعود نے سر ہلا کر کہا اور اس کا سر پوست کے ڈوڈے کی طرح دیر تک ہلتا رہا۔

"یہ فقرہ مُفتی جی کا نہیں۔" عماد آہستگی سے بولا۔ "ذوالنون مصری کا ہے، کیوں جی؟"

لیکن مُفتی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مَیں اپنی موت کے غم میں دُکھ سے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ یعنی مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ریڈیو سٹیشن لاہور کا نیا ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے گا اور اس کی پہلی، دوسری اور تیسری ٹرانسمشن کی ابتدا اخلاق احمد دہلوی، عزیز الرحمٰن اور نسرین محمود اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں، اسی خاص لہجے میں، وہی کپڑے پہنے ہوئے۔ کتنے ظلم کی بات ہے، وہ ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے۔

ضرور کریں گے، میرے دل نے کہا اور مجھے تھوڑی سی تسلی ہُوئی۔ باہر کے لوگوں کے بارے میں تو مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا، لیکن لاہور کے لوگ اس کمی کو ضرور محسوس کریں گے، شدت سے کریں گے اور پھر دیر تک کرتے رہیں گے۔ شاید کئی سالوں تک، بہت ممکن ہے ساری عمر۔

آخر میرا مر جانا اور ختم ہو جانا اور اس جہاں سے چلے جانا کوئی معمولی بات تھوڑی ہو گی۔ ایک عام ادیب اور فن کار مر جاتا ہے تو ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ میں تو پھر کئی حلقوں کا محبوب ہوں۔ قارئین کا محبوب، سامعین کا محبوب، ناظرین کا محبوب۔ یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح سے زندہ رہ سکیں گے اور راتوں کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر جھاڑ کر اور اپنے تکیے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سو جایا کریں گے بھلا؟

پھر مجھے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں چل رہا ہوں یا کھڑا ہوں، بیٹھا ہوں یا پتھر سے ٹیک لگا کر سو رہا ہوں، گھر میں ہوں یا راستے پر ہوں۔ سفر ہے یا حضر ہے۔ وجود مٹ گیا اور اہمیت کا بت ایستادہ رہ گیا۔ بہت بڑا بت، تانبے رانگ اور پیتل کی دھات کا مرکب، براسو سے چمکا ہوا، دھوپ میں چمکتا ہوا۔ برگد کے کئی سو سالہ پیڑ کے نیچے جرنیلی سڑک سے میل سوا میل دور درختوں کے ایک وسیع جھنڈ کے پاس۔

ابھی مجھے اس جہان سے گزرے دو گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ خبر سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن پہنچے گی۔ شام کا وقت ہو گا اور سٹیشن کے اندر اور باہر بڑی خاموشی ہو گی۔ پروگرام سٹاف کے لوگ جا چکے ہوں گے۔ ٹرانسمشن ڈیوٹی کا سٹاف سٹوڈیو کی طرف مصروفِ عمل ہو گا۔ چودھری بشیر کسی ضروری کام سے دفتر آئے ہوں گے یا نہیں آئے ہوں گے لیکن اکرم بٹ اپنے کمرے میں موجود ہو گا اور اس کے لیے یہ خبر کافی تکلیف دہ ہو گی۔ وہ اپنے ان تمام دوستوں کو فون کرے گا اور ہر ایک سے ایک ہی بات کہے گا کہ "سنا ہے اشفاق صاحب ہمارے ساتھ کیا ظلم کر گئے"۔ اور پھر اس کے بعد اسے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آتے جائیں گے جب ہم پرانے سٹیشن پر گیراج کینٹین میں، سٹوڈیو میں، اپنے اپنے کمروں میں، برآمدوں میں، لان پر، ڈی سی پی کے اندر ریہرسل سے پہلے اور ریہرسل کے بعد بیٹھا کرتے تھے، ملا کرتے تھے، بولا کرتے تھے اور محبتیں کیا کرتے تھے اور ہمارے اندر کمال محبت کے باوجود دُوری کا احساس رہا کرتا تھا۔

پھر ڈیوٹی رُوم میں راولپنڈی سے مسعود کا فون آئے گا اور چپڑاسی بھاگا بھاگا اکرم بٹ کو بُلا کر لے جائے گا اور ان دونوں کے درمیان بڑی درد بھری باتیں ہوں گی۔ مسعود چونکہ مجھے پہلے سے جانتا ہے اور ہماری دوستی کے سالوں کا دقفہ طویل ہے اس لیے ایک سینئر کی حیثیت سے

وہ اکرم بٹ پر حاوی۔ ہے گا۔ وہ مری اور آزاد کشمیر اور راولپنڈی کے قیام کی باتیں زیادہ کرے گا اور اکرم بٹ اس کا ماتحت ہونے کی حیثیت سے اور دوسرے اس کے مقابلے میں مجھے کم مدت کے لیے جاننے کی وجہ سے دبا دبا سا رہے گا اور "بس جی مسعود صاحب" "بس جی... حد کر گئے خان صاحب... کمر توڑ گئے" وغیرہ ہی کہتا رہے گا۔ پھر ان دونوں کے درمیان شام سوا آٹھ بجے خصوصی پروگرام کی بات ہوگی اور اکرم کہے گا "میں نے بندوبست کرنا شروع کر دیا ہے۔ گاڑی ابھی آتی ہے اور میں لوگوں کو جمع کرتا ہوں۔ کتنا وقت رکھیں؟" "پندرہ منٹ کافی ہیں" مسعود کہے گا۔

"ناں جی پندرہ منٹ تو کچھ بھی نہیں مسعود صاحب، خان صاحب ادیب بھی تھے براڈ کاسٹر بھی تھے، سرکاری ملازم بھی تھے، پیارے دوست بھی تھے، پندرہ منٹ تو بہت کم ہیں"

"تو پھر سوچ لو ہم تو یہاں پندرہ منٹ کا پروگرام ہی کر رہے ہیں۔ تین منٹ کا چیک شہاب صاحب کا ہے، وہ ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ ساڑھے آٹھ منٹ کی تقریر مفتی صاحب کی ہے۔ بڑے انوکھے انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے انہوں نے۔ تین ساڑھے تین منٹ میرے ہیں۔ باقی وقت عمر اور کلیم نے لیا ہے"

کلیم کون جی؟"

"او یار عطا حسین کلیم، اس کے ساتھ بھی بڑے تعلقات تھے اشفاق کے"

"ہم تو پھر آدھ گھنٹہ لیں گے مسعود صاحب۔ لاہور سٹیشن کا بڑا ستون تھا تلقین شاہ۔ اس کے لیے تو آدھ گھنٹہ بھی ناکافی ہے"

"ٹھیک ہے دیکھ لو۔ زیڈ اے بخاری سے زیادہ ٹائم نہ مل جائے، ورنہ اعتراض ہوگا ڈسکریپنسی ٹھیک نہیں ہوتی"

"وہ تو سب مانتا ہوں مسعود صاحب، لیکن ہمارا بھی تو دل ہے۔ یہاں لوگ ان کی عزت ہی نہیں کرتے تھے ان سے محبت بھی کرتے تھے"

"کیا کہنے یار اس کے، اب ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔ نظامی صاحب گئے، محمد حسین چلا گیا، اب یہ بھی دھوکا دے گیا۔ ویسے یار اکرم بٹ ہمارے ساتھ کے لوگ جا رہے ہیں، ایک، ایک کر کے"

"ہاں سر اب اندر گھنٹی سی بجنے لگی ہے اور دوسری بات یہ ہے۔۔۔ مسعود صاحب کہ۔۔۔"

"اچھا میں بھول نہ جاؤں تمہارے پاس اس کی آواز کا کوئی ٹیپ تو ہوگا؟"

"لعنت ہو جی مسعود صاحب ان نئے نئے پروڈیوسروں پر سارے ٹیپ اسی ریز کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ کونسی چیز کس وقت کے لیے سنبھال کر رکھنی ہے۔ میرے پاس ایک ذاتی ٹیپ ہے جس میں اشفاق صاحب کی آواز محفوظ ہے۔ کوئی ڈسکشن تھی۔ ہماری ثقافت قسم کی۔ اس میں کافی بولے ہیں اور اچھا چنک ہے۔"

"تو پھر ہم کو بھی لائنوں پر ریکارڈ کرا دو۔"

"آپ ٹرانس کرپشن سے لیں مسعود صاحب ان کے پاس خان صاحب کا دو گھنٹے کا پروگرام محفوظ ہے۔ ایک افسانہ پڑھا ہے انہوں نے اپنی آواز میں۔ اور میری اپلیکیشن کر ایسے نہیں پھینک دینا مسعود صاحب میں نے ایک کاپی ڈائرکٹ اسی لیے آپ کے نام بھیجی ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا میاں یہ کوئی وقت ہے تم بس ایک پروگرام کر دو اچھا سا۔ یادگار، ہمارا یار تھا، اس کے لیے اتنا بھی نہ کر سکے تو پھر لعنت ہے ہم پر۔"

"آپ بے فکر رہیں جی ایک مرتبہ تو لوگوں کے آنسو نکل آئیں گے۔"

"شاباش لاہور سٹیشن کی روایت قائم رہنی چاہیے۔۔۔ اچھا بھئی۔"

"ایک منٹ سر۔۔۔ مسعود صاحب۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ نیوز میں اشفاق صاحب کی خبر آ رہی ہے یا نہیں۔"

"آ رہی ہے، آنی کیوں نہیں تھی۔ یہ اس کا حق ہے نیشنل نیوز بلٹن میں آئے گی۔۔۔ جی ایم اثر اس کا یار ہے۔ اس نے بڑی اچھی سٹوری بنائی ہے، بہت رو رہا تھا بیچارہ۔"

خان صاحب تو اس کے شاگرد بھی رہے ہیں شاید۔"

"شاگرد کیا، وہ بھی ٹھیک ہے، لیکن بڑے گہرے دوست تھے۔ قبلی، نہایت قریبی۔ اچھا بھئی۔"

"اچھا سر خدا حافظ۔"

پھر اکرم بٹ کو، ریاض محمود کو، ظہیر صدیقی کو اور قدیر ملک کو پروگرام تیار کرنے کی بھبوڑی

پڑے گی۔ جب وقت کم ہو اور پروگرام زیادہ فیڈ کرنا ہو تو ہمیشہ مشکل پڑ جایا کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کافی پریشان ہوں گے اور لوگوں کی بے وقت موت پر ہم اسی طرح پریشان ہوا کرتے تھے۔ صوفی تبسم پیارے سمن آباد سے آجائیں گے۔ فیض صاحب اگر یہاں ہوئے تو وہ بھی چند جملے کہنے کے لیے ضرور آئیں گے۔ ندیم قاسمی چونکہ سمن آباد ہی میں رہتے ہیں اس لیے صوفی صاحب کو لانے والی گاڑی انہیں بھی ساتھ ہی لیتی آئے گی۔ اے حمید بھی سمن آباد رہتا ہے، لیکن جب وہ یہ خبر سنے گا تو دکھ سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ رسمی گفتگو کرنے پر لعنت بھیجتا ہوا آنے سے انکار کر دے گا اور پھر وہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرنے لگیں گے جب قدسیہ اور میں پہلی مرتبہ ان کے گھر پرانی میسوہ منڈی کے قریب گئے تھے۔ بانو نے ریحانہ سے ان چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی بڑی تعریف کی تھی جن میں اے حمید نے ہمیں کشمیری چائے پلائی تھی اور اے حمید نے الماری سے ساری پیالیاں نکال کر انہیں اخباری کاغذوں میں لپیٹ کر بانو قدسیہ کے حوالے کر دی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: بس بس اب بولیں نہ بالکل۔" اور بانو نے بھرائی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

آفتاب احمد کو جب ٹیلی فون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کے روئے گا اور پھر رات بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ ہو گا۔ محمد حسین کے فوت ہونے پر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی آرزو ہو گی کہ ٹی وی پر جو پروگرام ہو وہ قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جائے، لیکن دوسرے لوگوں کو اس میں تامل ہو گا۔ اصل میں وہ اس تامل میں حق بجانب ہوں گے۔ ایک علاقائی ادیب یا علاقائی ٹی وی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنا مناسب بھی نہیں۔ اس سے ایک پریسی ڈینٹ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے علاقوں کے لوگ تقاضا کریں گے کہ اشفاق نیشنل فگر تھا، اس لیے اس کا پروگرام جائز طور پر قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جانا چاہیے۔ دوسرے لوگ جو ان سے اتفاق نہیں

کریں گے۔ اپنی دلیل میں شدت اختیار نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مرے ہوئے آدمی کو شدت سے کنڈیم کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آخر فیصلہ یہ ہوگا کہ نو بجے والی خبروں کی تصویری جھلک میں ذرا سا حصہ اس پروگرام کا بھی دکھا دیا جائے جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد بھی میرے حامی باہر لان میں اندر کوری ڈور میں کافی دیر تک یہ کہتے پھریں گے۔ یہ سب اس ... حرامی کی شرارت ہے۔ جب وقت پڑتا تھا تو کیا دست بستہ سکرپٹ لینے اور ڈرامہ لکھوانے چلا جایا کرتا تھا اور اب انکاری ہو گیا ہے۔"

اُردو بورڈ کے ملازمین بھی یہ خبر سُن کر سکتے میں آجائیں گے۔ ربانی کا، فضل کا اور سُلطان صاحب کا بُرا حال ہوگا۔ شریف دین غم زدہ ہوگا۔ لیکن اس کو فکر ہوگی کہ یہ خبر تمام اخباروں میں نمایاں جگہ پر لگ جائے۔ اس کے پاس چونکہ میری پاسپورٹ سائز کی بہت تصویریں مختلف پوزوں میں ہیں اس لیے وہ دفتر پہنچ کر اپنی الماری سے مختلف تصویریں نکالے گا۔ ان کی پُشت پر اپنی مخنی لکھائی میں اخباروں کے نام لکھے گا۔ اُردو اور انگریزی میں سانحہ جانکاہ کا مضمون بنا کر انہیں نفاست سے ٹائپ کرے گا اور اپنے پلے سے رکشا لے کر پہلے سیدھا فضل کے گھر جائے گا اور پھر وہ دونوں اخباروں کے دفتروں کے چکر لگائیں گے۔

امجد حسین کو فکر ہوگی کہ یہ خبر چوکھٹے کے اندر چھوٹی تصویر کے ساتھ فرنٹ پیج پر آئے۔ اگر ادریس وہاں ہُوا تو وہ زور دے گا کہ نیوز کم از کم دو کالمی ہونی چاہیے۔ نور آرٹسٹ اگر اتفاق سے دفتر میں ہی ہُوا تو وہ ادریس کی تائید کرے گا۔ شاہ جی نیوز تیار کریں گے۔ بائیو ڈیٹا شریف الدین اور فضل فراہم کریں گے۔ میٹر کمپوز ہو جائے گا۔ لیکن اسلام آباد سے اکنومک کونسل کی ایک خبر آجانے پر مجبوراً میری خبر کو اخبار کے آخر میں دینا پڑے گا۔ آخری وقت میں میک اپ کے وقت پھر مشکل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ تیسری دنیا کی ایک خبر جو بیک پیج پر کیری اُدھر ہو رہی ہوگی وہ میرے لیے وقف جگہ پر حق شفع کر دے گی اور امجد حسین جھلا کر اور مجبور ہو کر میری خبر کو اندر تیسرے صفحے پر لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہوگی تو پتوکی، جھنگ، ساہیوال، موڑ کھنڈا، عبدو کے، علی اوک وغیرہ کے لوگ کہیں گے: "لو جی ایہہ وی ختم ہو گیا۔ بڑا سیانا بندہ سی کیا تقدیر شاہ"

داروپ بھریاسی؟ اور بڑی بوڑھیاں یہ خبر سُن کر کہیں گی: بابا تلقین شاہ فوت ہو گیا تے ہُن ایہہ پروگرام کون کریا کرد؟"

حیدر علی نمبردار کہے گا: ہُن اسیں کی دَسیے۔ ایہہ گورنمنٹ دے کم این جدھی مرضی ڈیوٹی لگا دیوے۔

ٹھیک اے نمبردار اکم تے چلدے ای رہندے این۔ اُنج بڑا سیانا بابا سی۔

رات کو جب ٹی وی پر خبرنامہ میں یہ خبر نشر ہوگی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہوگا۔ بہت سے ناظرین آرزومند ہوں گے کہ میرے کسی پُرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ خاص طور پر نکھار پروگرام کی جس میں مہمان امانت علی ہے اور میزبان مَیں ہوں۔ ٹیلی ویژن والوں کی اس کوتاہی پر ناظرین اپنے اپنے گھروں میں نکتہ چینی بھی کریں گے لیکن پھر دوسری باتوں میں اُلجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں جہاں لکھنے لکھانے اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا کام ہوتا ہے میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا لیکن اچھا انسان نہیں تھا۔

ٹی وی پر نیوز سُننے کے بعد کچھ لوگ گہری سوچ میں ڈوب جائیں گے کہ دیکھیں اب اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کس کو ملتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کی بیویاں کہیں گی: سب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ چانس آپ کو ملنا چاہیے۔ آخر آپ نے ساری عمر اُردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان سے محبت کی ہے۔

خاوند ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا۔ بیگم آج کل خدمت اور محبت کو کوئی نہیں پُوچھتا۔ یہ سب کا نٹیکٹس کی بات ہے۔ اب مرحوم کو اُردو سے کہاں محبت تھی اور اس نے کس طرح سے اس زبان کی خدمت کی تھی۔ یہ تو تعلقات کی بات ہے۔

بیوی کہے گی: لیکن ڈرامے بڑے اچھے لکھتا تھا اور باتیں بھی بڑی مزیدار کرتا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے" میاں ایمانداری کے ساتھ جواب دے گا: اس کے ہم بھی معترف ہیں لیکن اس کے لیے اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کہاں تک جائز ہے؟ یہ سوال ہے جو معاشرے کے حاکمانِ وقت سے پوچھا جانا چاہیے۔ یہ سب دھاندلیاں ہیں بیوی اور اس دَور میں ہم لوگوں کو کوئی نہیں پُوچھتا۔

پھر بڑی دیر تک بڑے گھروں میں اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کا ذکر ہوتا رہے گا۔ کچھ ایسے لوگوں کے نام یاد کرنے کی کوششیں ہوں گی جن کے براہِ راست حفیظ پیرزادہ سے تعلقات ہوں۔ ایک آدھ ٹیلی فون پی آئی اے کے دفتر بھی ہوگا کہ صبح پہلے جہاز سے اسلام آباد کے لیے سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔

اس اک ذراسی خبر سے گھر میں کہرام ہوگا۔ ادبی حلقوں میں محتاط تنقید ہوگی۔ ریڈیو سننے والے دیہاتی حلقوں میں غم ہوگا۔ دوستوں کے درمیان آئندہ کی فکر ہوگی۔ علمی حلقوں میں، ہلچل اور منصوبہ بندی ہوگی۔ اُردو بورڈ کے ملازمین کو تشویش ہوگی پھر صبح ہوگی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لیے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔

شاہ عالمی میں ایک کراکری مرچنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھی دکاندار کے پاس جا کر کہے گا: "یار یہ دیکھا تم نے تلقین شاہ مر گیا۔ بیچارہ"

"کب؟" ساتھی دکاندار بھونچکا ہو کر پوچھے گا۔

"تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا، یہ دیکھو اس کی تصویر۔ ایک مرتبہ آئے نہیں تھے ہماری دکان پر سلور کی چلمچی خریدنے وہ اور اس کی بیوی"

"وہ اس کی بیوی تھی نیلے سوٹ والی"

"ہاں وہ بھی ڈرامے لکھتی ہے۔ اس نے ٹیلی ویژن پر گھوڑے والا ڈرامہ لکھا تھا"

"وہ تو اس کا ڈرامہ تھا تلقین شاہ کا اپنا۔ اس کی بیوی کا دوسرا تھا جس میں ایک آدمی خفیہ طور پر دوسری شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ سال تک اس کے بیوی بچوں کو علم ہی نہیں ہوتا"

"بڑا ظلم ہوا یار، ابھی تو جوان ہی تھا، پچاس سال کا بھی نہیں تھا"

"پاکستان میں اتنی عمر ہی ہوتی ہے شیخ صاحب! پچاس سال کا آدمی دوسرے کنارے پر لگ جاتا ہے۔ کوئی قسمت والا ہی دس سال اُوپر گزارتا ہے"

"پہلے زمانے میں عمریں کافی لمبی ہوتی تھیں"

"اس زمانے کی خوراکیں بھی تو دیکھو۔ خالص گھی، خالص آٹا، دُودھ دہی لسی، سادہ غذا، شیر ببر جیسے لوگ ہوا کرتے تھے۔ کیا مرد کیا عورتیں"

"ولیت کے لوگ تو اب بھی لال سُرخ ہوتے ہیں۔"

"وہاں بے فکری ہے بھا جی۔ کوئی بے ایمانی نہیں، رشوت نہیں، بک بک نہیں، سب کام سرکار کرتی ہے۔ لال سُرخ تو آپ ہی ہونا ہُوا۔"

"وہ میم پھر نہیں آئی پُرانے سیٹ خریدنے والی۔"

"کمینی ہے سالی آئی تھی ٹوٹی ہوئی پیالی لے کر کہنے لگی تم نے ٹوٹی ہوئی پیالی رکھ دی پیکنگ میں اس کو تبدیل کرو۔"

"تم نے انکار کر دینا تھا۔"

"کوئی دیسی عورت ہوتی تو مَیں انکار بھی کر دیتا۔ ہمارے ملک کا سوال تھا۔ مَیں نے کہا لاؤ میم صاحب پیالی تبدیل کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے سارے دکاندار ایسے نہیں ہوتے ہم لوگ دیدہ والے ہیں، مہمان نواز ہیں۔"

"بڑے مہمان تھے بھئی سجانی کے لڑکے کی شادی پر کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے ملا کر۔"

"بلیک کی یہی تو برکت ہے شیخ صاحب ایک نانواں دوسرے عزت، تیسرے تعلقات۔"

"ہم نے بلیک نہ کرکے کیا بنا لیا۔"

"کچھ نہیں جی کچھ نہیں، ایسے ہی مرجائیں گے دس دس جوڑتے۔"

اس کے چند گھنٹوں بعد دوستوں کے درمیان ٹیلی فون پر باتیں ہوں گی۔ مجھے یاد کیا جائے گا۔ ہر کوئی مجھ سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے گا اور دوسرے کو خفیف کرے گا کہ باوجود مجھے اچھی طرح سے جاننے کے وہ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ تابش کے بال اور پھول جائیں گے۔ آنکھیں اور خاموش ہو جائیں گی۔ زبان بالکل گنگ ہو گی۔ ریاض محمود اپنا زرعی پروگرام ریکارڈ کرنے کے لیے سٹوڈیو میں موجود ہو گا اور انجینئروں کی خوشامد کر رہا ہو گا۔ تلقین شاہ لکھنے والے کا بیئسٹ ہاف سیٹ چائے میں سے تین پیالیاں نکال کر — کے ٹو سگریٹ پی رہے ہوں گے اور اردو بورڈ کا عملہ پریشان ہو گا کہ اگلی تنخواہ کے لیے بلوں پر کون دستخط کرے گا۔ پھر ان میں سے دو تین مل کر اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بینک جائیں گے اور وہاں سے فارم لیں گے کہ ڈرائنگ اور ڈسبرسنگ آفیسر کے فوت ہو جانے کی صورت میں منسٹری کے سیکرٹری کے دستخط کیے جائیں اور تنخواہ نکالی جا سکے۔ پھر اُردو

بورڈ کے ملازمین شریف الدین کو شام کی گاڑی سے اسلام آباد روانہ کریں گے تاکہ وہ ڈاکٹر اجمل کے پیسے سی من سگنیچر لا سکے اور بینک سے تنخواہ ڈرا کی جا سکے۔ بیچاروں کو کافی تردد کرنا پڑے گا' لیکن شریف الدین کی حکمتِ عملی سے مشکل راہیں آسان ہو جائیں گی اور ان کو وقت پر تنخواہ ملنے کی اُمید بندھ جائے گی۔ اس اُمید بندھنے کے بعد جب انہیں اطمینان ہو جائے گا تو وہ مجھے یاد کریں گے۔ فضلی ربانی' محمد علی سلطان صاحب' طاہر اور بابو خاں دل کھول کر مجھے یاد کرنے کی کوشش کریں گے' لیکن اپنے ساتھیوں کے خوف سے کچھ تعریف نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ ان پر مرحوم ڈائریکٹر کے پٹھو ہونے کا الزام لگ جائے گا اور نئے آنے والے ڈائریکٹر سے ان کی شکایت ہو جائے گی کہ یہ پرانے ڈائریکٹر کو دل سے چاہتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فن کار اور شو مین بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی چوک سے لے کر میو ہسپتال کے چوک تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچوان گھوڑوں کو اونچے اور قریبی کوچوان کو نیچے لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا' بجلی کا بل آتا رہے گا۔ فقیر سوتا رہے گا۔ چوڑھے ناکی مارتے رہیں گے استاد پڑھاتے رہیں گے۔ ریکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ قوال گاتے رہیں گے۔ رنڈی ناچتی رہے گی' ڈاکیہ چلتا رہے گا۔ سوئی گیس نکلتی رہے گی' تقریریں ہوتی رہیں گی' غزلیں لکھی جاتی رہیں گی۔ سوئی میں دھاگہ پڑتا رہے گا' قتل ہوتا رہے گا۔ زچہ مسکراتی رہے گی' بچہ پیدا ہوتا رہے گا۔

برانڈرتھ روڈ کی دکانوں پر نئے مکان بنانے والی بیگمات دیسی ٹوٹکوں اور فیشنوں کے نمونے دیکھ رہی ہوں گی۔ ان کے پرسوں میں سو سو کے نوٹ ہوں گے۔ ان کے جسم بڑے بڑے اور سینے موٹے موٹے ہوں گے اور ان کے خاوند اپنے اپنے مرکزوں پر روپے بنا رہے ہوں گے۔ کرشن نگر کی لڑکی نے ساری رات لگا کر باریک باریک لفظوں کی کشیدہ کاری سے ایک محبت نامہ لکھا ہوگا اور ہسٹری کی کتاب میں رکھ کر برقعہ اوڑھ کر اسے پوسٹ کرنے جا رہی ہوگی۔ شادمان کی لڑکی ٹیلیفون پر اپنے محبوب سے گفتگو کر رہی ہوگی اور آپریٹر درمیان میں سُن رہا ہوگا۔ موچی کے باہر بڈھے گھوڑوں کے نعل لگ رہے ہوں گے اور گھوڑا ہسپتال میں نوعمر بچھیڑے آختہ کیے جا رہے ہوں گے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی لڑکیاں تاریک محلوں میں جا کر چھلے اور ربڑ مفت تقسیم کر رہی ہوں گی اور رجسٹر میں اندراج کر رہی ہوں گی۔ ان میں سے کئی ایک کی پچھلے مہینے کی تنخواہ کابل بابو نے نہیں بنایا ہو گا اور ان کے چھوٹے بھائی کو سکول سے اُٹھا کر خرادیے کے پاس بٹھا دیا ہو گا۔ بڈھے عرضی نویس کا پیشاب بند ہو گا اور اس کے پوتے اُسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لائے ہوں گے۔ خزانچی نوٹوں کی گٹھیوں میں سوراخ کر کے دھاگے پرو رہے ہوں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے مائیں لڑکیوں سے پوچھ رہی ہوں گی کہ ان کے لیے کون سی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ چلّہ کاٹنے والے دُعائے حزب البحر پر داہنے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اُوپر کی طرف اُٹھا رہے ہوں گے۔ لڈو بناتا ہُوا حلوائی اُٹھ کر سامنے والی نالی پر پیشاب کر رہا ہو گا۔ لبرٹی مارکیٹ میں دو نوجوان ایک لڑکی کے پیچھے گھوم رہے ہوں گے۔ دلہنوں کے جسموں سے آج ایک اجنبی مہک بھی اُٹھ رہی ہو گی۔ بچے گلی میں کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں گے اور قریبی مکان میں ایک ماں اپنے بچے کو پیٹ رہی ہو گی جس کا خاوند ایک اور عورت کے ساتھ جہانگیر کے مقبرے کی سیر کر رہا ہو گا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں کھلے پائنچوں کی شلواریں پہن کر لڑکوں سے یُونین کی باتوں میں مصروف ہوں گی اور ہیلتھ سیکرٹری لاٹ صاحب کے دفتر میں اپنی ریٹائرمنٹ کے خوف سے پریشانی ہو رہا ہو گا۔ کچھ جسم ماربل کے باتھ روم میں واش کر رہے ہوں گے۔ کچھ جپس کے غسل خانوں میں نہا رہے ہوں گے۔ کچھ مسجدوں کے سقاووں میں پاک ہو رہے ہوں گے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک ادیب اور فن کار نے ساری عمر چھوٹی چھوٹی کر کے اپنی شہرت اور نیک نامی کا تالاب بھرا ہو گا اور دن رات ایک کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہو گا اور اس ایک چھوٹے سے حادثے سے وہ سارے دلوں سے نکل گیا ہو گا۔ ہر یاد سے محو ہو گیا ہو گا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے جنم دیا ہو گا۔ اس دل سے بھی جس نے اُسے سچ مچ یاد کیا تھا اور اس دل سے بھی جس نے اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دل محبت کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز اتوار کے دن حلقۂ ارباب ذوق ادبی میں میرے لیے ایک قرارداد تعزیت پاس کی جائے گی۔ عین اسی وقت حلقۂ ارباب ذوق سیاسی میں بھی ایک قرارداد تعزیت پیش کی جائے گی۔ سب متفقہ طور پر اسے منظور کریں گے لیکن اس کے آخری فقرے پر بحث

کا آغاز ہوگا کہ حلقہ اربابِ ذوق کا یہ اجلاس حکومت سے پُرزور اپیل کرتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین کے لیے کسی وظیفے کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حاضرین دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک اس کے حق میں ہوگا کہ یہ فقرہ رہنے دیا جائے کیونکہ مرحوم ایک صاحبِ حیثیت ادیب تھا اور اس کی اپنی ذاتی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں موجود ہے۔ پھر کوٹھی کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ کچھ اسے دو کنال کی بتائیں گے، کچھ تین کنال کی، کچھ دبی زبان میں کہیں گے کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی خاتون ہے وہ نوکری بھی کر سکتی ہے اور لکھنے لکھانے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ ریڈیو آنے جانے والے ایک ادیب سامعین کو بتائیں گے کہ بانو کی ذاتی آمدنی ریڈیو ٹی وی سے دو ہزار سے کم نہیں۔ میرے ایک دُور کے رشتہ دار ادیب اعلان کریں گے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا فرد تھا اور اس کا اپنے باپ کی جایداد میں بڑا حصّہ ہے جو اسے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پھر کوئی صاحب بتائیں گے کہ ورثا کو بورڈ سے گریجویٹی بھی ملے گی۔ سٹیٹ لائف انشورنس کے ایک ادب نواز کلرک، جو حلقے کی میٹنگوں میں باقاعدگی سے آتے ہیں بتلائیں گے، اس نے اپنے تینوں بچوں کی انشورنس بھی کرا رکھی تھی۔ گو ان کی رقم بیس بیس ہزار سے زائد نہیں۔ طویل بحث کے بعد اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ ہوگا کہ آخری فقرہ کاٹ دیا جائے؛ چنانچہ آخری فقرہ کٹ جائے گا۔ پھر مجھ پر آٹھ آٹھ منٹ کے تین مقالے پڑھے جائیں گے اور آخری مضمون میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ میں دراصل پنجابی زبان کا ایک ادیب اور شاعر تھا اور مجھے پنجاب سے اور اس کی ثقافت سے بے انتہا پیار تھا۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونے لگیں گے اور میری پہلی برسی آ جائے گی۔ یہ کشور ناہید کے لیے آزمائش کی گھڑی ہوگی، کیونکہ ہال کی ڈیٹس پہلے سے بُک ہو چکی ہوں گی اور میری برسی کے روز آل پاکستان ٹیکنیکل سکولز کے ہنرمند طلبا کا تقریری مقابلہ ہوگا۔ کشور کو پاکستان سنٹر میں میری برسی نہ منا سکنے کا دلی افسوس ہوگا اور وہ رات گئے تک یوسف کامران کی موجودگی میں کفِ افسوس ملتی رہے گی۔ لوگ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس کو ایک المیہ شروع بنا لیں گے اور وہ لوگ جو عمر بھر مجھے جائز طور پر ناپسند کرتے رہے تھے وہ بھی کشور ناہید کے برخلاف دھڑے میں شامل ہو جائیں گے۔ مجھ سے محبت کی بنا پر نہیں کشور کو ذلیل کرنے کی غرض

سے، پھر ذوالفقار تابش کی کوششوں سے گلڈ کے بڑے کمرے میں یہ تقریب منائی جائے گی اور عتیق اللہ، شکور بیدل، ریاض محمود، غلام قادر، سلیم افراط مجھ پر مضمون پڑھیں گے۔

کس قدر دُکھ کی بات ہے کہ زمانہ ہم جیسے عظیم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ہم کو بھلا دے گا۔ مَیں ہُوا، نپولین ہُوا، شہنشاہ جہانگیر ہُوا، الفرج رونی ہُوا، ماوراالنہر کے علما ہُوئے، مصر کا ناصر ہُوا، عبدالرحمٰن چغتائی ہُوا کسی کو بھی ہماری ضرورت نہ رہے گی اور اتنے بڑے خلا پانی میں پھینکے ہُوئے پتھر کی طرح بھر جائیں گے۔ ہماری اتنی بڑی قربانیوں کا کہ ہم فوت ہوئے اور فوت ہونا کوئی آسان کام نہیں لوگ یہ صلا دیں گے۔ افسوس زمانہ کس قدر بے وفا ہے اور کس درجہ فراموش کار ہے۔

"اوئے مرنا ہے گدھے؟" مَیں نے اپنے سینے پر لیڈر کی سوٹی کی روک محسوس کی اور آنکھیں کھول کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کدھر چلے جا رہے تھے؟" اس نے رُک کر پوچھا۔ "اگر مَیں بھاگ کر سوٹی آگے نہ کرتا تو اس کھڈ میں جا گرتے۔"

"مَیں سوچ رہا تھا۔" مَیں نے خفیف ہو کر پُوچھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"زندگی اور زندگی کی خوبصورتیوں کے بارے میں۔"

"اور چلے جا رہے تھے موت کی طرف۔"

مسعود نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا سے

دما دم رواں ہے یم زندگی   ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے   یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

پھر جس کوہستانی نے ممتاز مفتی کو اٹھایا ہُوا تھا۔ وہ اچانک رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ رک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی بھوری داڑھی کو خجالت کے ساتھ کھجا کر کہا: "اب تم نیچے آؤ۔"

"یہ سالا تو مر جائے گا تمھارے نیچے آ کر خان۔" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "کوئی اور خدمت بتاؤ۔"

اس نے کوئی اور خدمت نہ بتائی تو مفتی بولا: "ہم شاید اس کا مطلب نہیں سمجھے یہ کچھ اور

چاہتا ہے۔"

"اور کیا چاہے گا۔" مسعود قہقہہ مار کر بولا۔ "اب تم نیچے کا مطلب صاف ہے یہ کون سی فارسی بول رہا ہے۔"

"کیا بات ہے خان۔" عماد نے سنجیدگی سے پوچھا تو خان خاموش رہا۔

مُفتی نے کہا۔ "ٹھہرو یار میں نیچے ہی اُترتا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ یہ کیا چاہتا ہے۔"

مُفتی کوہستانی کی پیٹھ پر سے پھسل کر نیچے کھڑا ہُوا تو کوہستانی منہ زور بچھڑے کی طرح ترائی کی طرف بھاگ گیا اور پچیس تیس فٹ نیچے اُتر کر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔

"لو بھئی حد ہو گئی۔" اعظمی نے کہا۔ "یہ سالا ہم میں سے پہلا آدمی ہے جس کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔"

"واقعی یار۔" لینڈ غمزدہ ہو کر بولا۔ "ہم میں سے کسی نے پیشاب ہی نہیں کیا۔ حد ہو گئی۔"

"لیکن مُفتی جی تو ہر آدھ گھنٹہ بعد پیشاب کیا کرتے ہیں۔" عماد نے کہا۔

"آج کچھ یاد ہی نہیں رہا۔" مُفتی نے دماغ پر زور دے کر کہا۔ "آج کا دن تو ایسے ہی گزر گیا۔"

"چل چل۔ بھاگ بھاگ۔" لینڈ نے چھڑی گھما کر کہا۔ "ابھی جا اپنی سواری کے پیچھے۔"

"نہ نہ خدا کے لیے۔ یہ تیس فٹ نیچے اُتر گیا تو پھر اسے واپس کون لائے گا۔ ایسے ہی چلنے دو جھیل پر پہنچ کر لے لیں گے۔"

"ویسے جھیل ابھی کتنی دُور ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو سب نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔ "ہنوز دِلّی دُور است!"

کوہستانی پیشاب کر کے واپس لَوٹ آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھُلا ہُوا آزار بند تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ وٹوانی کر رہا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ دونوں پاؤں چوڑائی کے رُخ کھول کر پتھروں پر رکھتا تھا تاکہ نجاست سے محفوظ رہے اور اس کے آزار بند میں کوئی چھینٹا نہ لگے۔ کوہستانی کی شلوار پر بکری کے دودھ کے اور اس کے ٹخنے سے رِسنے والے خون کے نشان تھے۔ اس کے پھٹے ہوئے پائینچے سے جسے اس نے گانٹھ دے رکھی تھی بکری کی تین چار مینگنیاں چمٹی ہوئی تھیں غلاظت اور گندگی سے شلوار کا رنگ مٹمیلا ہو رہا تھا۔ گھاٹی سے اُوپر آ کر وہ کزک مرغی کی طرح مُفتی کے

سامنے بیٹھ گیا۔

"ناں ناں خان" مفتی نے کہا: "پہلے تم اپنا کام ختم کر لو پھر اُٹھانا۔"

"کام تو ختم ہو گیا صیب" اس نے ہنس کر کہا۔

"نہیں یار ابھی کہاں ختم ہُوا ہے" مُفتی نے کہا: "ابھی تو آدھا ختم ہُوا ہے۔"

"بیٹھو بیٹھو" اس نے خشمگیں لہجے میں کہا: "ابھی اور اُوپر جانا ہے۔"

مُفتی ڈر کے مارے کچھ کہے بغیر پھر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور کوہستانی مزے سے دولتی کرتا ہُوا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مُفتی اس کی پیٹھ پر سوار تھا اور اس نے نظریں اُوپر آسمان کی طرف اٹھا رکھی تھیں۔ اعظمی نے کہا: "کوئی بات نہیں مُفتی جی نگاہیں نیچی کر لو۔ کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔" مُفتی شرمندہ سا ہو گیا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر سر ہلانے لگا۔ کوہستانی دونوں ہاتھوں سے مصروف ایک کھڑی چٹان پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے تار پر لیڈی چلا کرتی ہے۔ اس کے کندھوں پر مُفتی خوف، شرمندگی اور اکتاہٹ کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ اب کوہستانی اُسے نیچے اُتار ہی دے تو اچھا ہے۔ کئی مرتبہ اُوپر چڑھا ہُوا انسان نیچے نہ اُتر سکنے کے خوف سے اور اُوپر چڑھنے لگتا ہے جو اور اُوپر نہیں چڑھ سکتا وہ سر بلندی کے ساتھ چپک کر وقت گزارنے لگتا ہے اور اس کی ساری عمر اسی دشت میں گزرنے لگتی ہے کہ ابھی اسی وقت ایک جھکڑ آئے گا اور اسے بلندی کے سینے سے چمٹے ہوئے پا کر نوچے گا۔ ہَوا میں اُچھالے گا اور پھر گہری اور اندھیری غاروں میں گرا دے گا۔ سر بلندیوں کے ساتھ چپکے ہوئے لوگ جھکڑوں کے خوف سے راتوں کو بھی نہیں سو سکتے۔ ان کی ساری عمر جاگتے رہنے اور چپکے رہنے میں بسر ہو جاتی ہے۔ پست لوگ جو عام طور پر زمین پر رہتے ہیں اور زمینوں پر چلنے میں جھکڑوں سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا اور پست تھا اور زمین پر چلتا تھا، اس وقت میری سب سے بڑی لگژری بگولوں کے پیچھے بھاگنا تھا۔ اپنی جُوتی میں پیشاب کر کے اگر بگولے کے اندر پھینکیں تو کھنکھناتے سکوں کی بڑی اُونچی آواز آتی ہے۔ یہ آواز سننے کے لیے ہم بگولوں کے پیچھے میلوں دُور بھاگا کرتے تھے۔ اس وقت ہمیں روپے کی طلب نہ تھی۔ اس کی جھنکار سے لطف اندوز ہونے کی آرزو تھی جس طرح موسیقی کا رسیا لفظوں سے آشنا نہیں ہوتا لَے اور سُر میں ڈوبا رہتا ہے۔

مسعود بڑی دیر سے کوہستانی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بایاں کندھا نیچے جھکا کر کہا۔ "مفتی جی یہ امرد پرستی کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہوگا؟"

"یہ پرانا سلسلہ ہے چن جی۔" مفتی نے اپنی نگاہیں آسمان سے ہٹائیں اور انہیں مسعود کے چہرے پر مرکوز کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کا رُخ تبدیل تو کیا۔

"میں سمجھا نہیں امرد پرستی۔" عماد نے کہا۔ "اگر یہ شاعری والا قصہ ہے تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر اس سے تمہاری مراد لواطت سے ہے تو میں مفتی جی کا بیان شوق سے سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"دیکھا دیکھا۔" اعظمی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "اس انجینئر کی سوچ ملاحظہ فرمائی آپ نے۔ جس سرکٹ میں ٹرانسٹرفٹ نہ ہو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں بھائی کو۔"

"خدا کے لیے۔" مسعود نے چڑ کر کہا۔ "تو ہر معاملے میں فقرے بازی نہ کیا کر اعظمی۔"

"تو اور کیا بازی کیا کروں۔" اعظمی تڑپ کر بولا۔ اس پر لیڈر زور سے ہنسا اور ہمیں اپنا ساتھی نہ پا کر کھٹ سے پہلو بدل گیا۔

"تو دھرمسالے کس سنہ میں آیا تھا مفتی؟" لیڈر نے پوچھا۔

"۱۹۳۵ء میں۔"

"۳۵ء میں۔" لیڈر نے حیران ہو کر کہا۔ "اس وقت تو میں بھی سکول میں پڑھتا تھا تو نے مجھے دیکھا کیوں نہیں؟"

مفتی نے کہا۔ "وہاں سینکڑوں طالب علم تھے۔ سال بہ سال اور آجاتے تھے۔ میں کس کس کو یاد رکھتا بھلا۔"

"واہ بھئی واہ۔" لیڈر ناراض ہو کر بولا۔ "میں تو اپنے سکول کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا۔ مجھے کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔"

"مجھے خوبصورت لڑکوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" مفتی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"لے بھئی۔" اعظمی نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ جو لیڈر نے کھٹ سے پہلو بدلا تھا اور ہم اسے پہلو بدلنا سمجھ رہے تھے، دراصل موضوع کو اپنی طرف گھیر کے لانا تھا۔"

"تم کو کس نے بتایا کہ تم خوبصورت تھے؟" عماد نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"دھرم سالے کے انگریز ایس پی نے۔" لیڈر نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔
"کیا کہا تھا اُس نے؟"
"وہ مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔"
"لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟"
"اس نے مجھ کو اپنی کوٹھی میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔"
"شاید وہ تم سے برآمدے میں ٹاکی مروانا چاہتا ہو؟"
"بالکل نہیں۔ اس نے مجھے آنکھ بھی ماری تھی۔"
"انگریز لوگ تو آنکھ مارنے کے یونہی عادی ہوتے تھے۔ ان کا آنکھ مارنا دیسی آنکھ مارنا تو نہیں تھا۔"
"وہ ہمارے سکول بھی آیا کرتا تھا۔"
"انگریز کے زمانے میں کوئی بھی گورا کسی وقت بھی سکول کا معائنہ کر سکتا تھا۔"
"وہ سکول کے اندر تھوڑی آتا تھا۔" لیڈر نے چڑ کر کہا۔ "وہ تو چھٹی کے وقت گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا۔"
"لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہارے لیے گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا؟"
"وہ اس لیے کہ جب میں سکول سے نکلتا تو ہولے ہولے میرے پیچھے چلنے لگتا۔"
"شاید وہ کسی تفتیش کے سلسلے میں وہاں آتا ہو اور اس کا تم پر شک ہو؟"
"مجھ پر کیا شک ہو سکتا تھا بھلا۔ میں تو اس وقت ساتویں میں پڑھتا تھا۔"
"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تمہارے والد مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔"
"مسلم لیگ کا ایس پی سے کیا تعلق؟"
"واہ۔ اُس زمانے میں ہر سیاسی آدمی اور اس کے بچے پر انگریز افسر کا شک ہوتا تھا۔"
"نہیں نہیں بکو مت۔" لیڈر نے جھلا کر کہا۔ "وہ مجھ پر عاشق تھا۔"
"اوہو! لیکن کچھ پتہ بھی چلے کہ اس کے عشق کا طریقۂ واردات کیا تھا؟"
"بس بس۔" اعظمی نے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا۔ "زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ہر حال میں لیڈر کے حال پر نگاہ رکھنی ہے اس کے ماضی پر نہیں۔"

مفتی نے بڑے شریفانہ انداز میں کہا: "یار دتم تو لیڈر کو انٹروگیٹ کر رہے ہو۔ جب اس نے کہہ دیا ہے کہ انگریز اس پر عاشق تھا تو تم تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ہاں ہمارے لیے اس سے بڑا فخر کا مقام اور کون سا ہو سکتا ہے کہ ہمارے لیڈر پر انگریز حکمران عاشق رہے ہیں"۔ اعظمی نے منہ پچکا کر کے کہا۔

"دیکھو دیکھو مُفتی" مسعود چیخا۔ "یہ اعظمی جان بُوجھ کر جمع کا صیغہ استعمال کر رہا ہے"۔

عمّاد ابھی تک اس معاملے میں سنجیدہ تھا اور بات کی تہہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا رُک کر اپنا چہرہ لیڈر کی طرف پھیرا اور پُوچھا۔ "اس ڈی ایس پی کا نام کیا تھا؟"

"ڈی ایس پی نہیں حرامی، ایس پی تھا"۔ لیڈر نے تنک کر کہا۔

"دیکھا دیکھا"۔ اعظمی دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ جان بُوجھ کر لیڈر کا مرتبہ کم کر رہا ہے۔ یہ اُلو کا ایس پی کو ڈی ایس پی بتا کر لیڈر کی بے عزتی کر رہا ہے"۔

اس پر ہم سب نے یک زبان ہو کر احتجاج کیا تو عمّاد نے معافی مانگ لی اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اس کا مقصد لیڈر کی تحقیر کرنا نہیں تھا بلکہ وہ بھول گیا تھا کہ ایس پی تھا یا ڈی ایس پی۔

مُفتی نے کہا: "خیر یار کوئی بات نہیں۔ ایس پی ہو یا ڈی ایس پی لیکن تھا انگریز اور ایک دیسی بچّے کے والدین کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ ان کے صاحبزادے پر ایک انگریز عاشق ہے"۔

مُفتی کی یہ بات سُن کر لیڈر کو قدرے سکون ہُوا اور وہ سر اُوپر کر کے چلنے لگا۔

کوہستانی نے ڈھیلہ پرے پھینک کر ازار بند باندھتے ہوئے کہا: "یہ انگریز پکّا حرامی تھا صیب"۔

"اے لو۔ خان سب سمجھ گیا ہے"۔ اعظمی نے کہا۔ "کیوں خان سب سمجھ رہا ناں جو کچھ ہمارے لیڈر کے ساتھ ہُوا؟"

"کچھ سمجھا صیب کچھ نہیں سمجھا، لیکن انگریز پکّا حرامی تھا"۔

"تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہُوئی" مسعود نے پُوچھا۔

"کہیں بھی نہیں صیب لیکن وہ بڑا پکّا حرامی تھا"۔

"لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟" عمّاد نے پوچھا۔